# حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرّانی

باب نمبر ۴

# جوانی

بچپن تو کھیل کود میں کاٹا۔ لیکن جب عمر اٹھارہ یا انیس سال کی ہوئی اور جوانی کی منزل میں قدم رکھا تب بھی بابا صاحب اس بات سے بالکل بے خبر رہے کہ دنیا کیا چیز ہے۔ مکر و فریب، تصنع اور ظاہر داری اور اس قسم کی دوسری باتوں سے انہیں انتہائی نفرت تھی۔ جب کبھی ایسی باتیں پیش آتیں تو آپ بے حد خفا ہوتے اور دیر تک متاثر رہتے۔ معلوم نہیں اللہ نے آپ کو کیا بنایا تھا۔ جہاں تک جنسی تعلقات کا معاملہ ہے آپ کو ماں اور بہن کے سوا کسی بات کا علم ہی نہ تھا نہ احساس۔ آپ کے ذوق کی بلندی، حُسن کی کشش کی دائرہ سے نکل کر فطرت کے دلکش نظاروں میں پھیل گئی تھی۔ درختوں میں، پھولوں میں، ٹھنڈی ہوائوں میں، طلوع آفتاب کے نازک حُسن میں اور غروب آفتاب کی مغموم فضا میں آپ کا دل اتنا ہی گرماتا تھا جیسے کسی دنیادار نوجوان کا دل پہلی نظر میں کسی حسینہ کو دیکھ کر گرماتا ہے۔

ہر چیز میں، چاہے کوئی چڑیا ہو، جنگلی پودا ہو یا جنگلی درخت بابا صاحب وہی انفرادیت محسوس کرتے تھے جو کوئی ذی شعور اپنے دوست کے سامنے بیٹھ کر محسوس کرتا ہے۔ رات کی خاموشی میں وہ محسوس کرتے کہ جگمگاتے تارے ان سے بات چیت کر رہے ہیں۔ چاندنی راتوں میں کبھی وہ چاند کی طرف دیکھتے اور کبھی چاندنی میں فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کی سخت کوشیاں سو رہی ہیں اور ایک سکوت اور ایک خمار کا عالم پوری کائنات پر چھایا ہوا ہے۔

کچھ ہوش اور کچھ بے ہوشی کے درمیان انہیں ایسا عالم نظر آتا جر موت و حیات کے مابین ایک برزخ ہوتا ہے۔ چاند کو وہ اپنے سے زیادہ دور نہیں سمجھتے تھے، اور ایسا محسوس کرتے تھے کہ اسے ذرا سی جنبش دینے پر وہ آغوش میں آسکتا ہے۔ دن کی تیز دھوپ میں جب سورج نصف النہار پر ہوتا اور حرارت سے جنگل میں سکوت طاری ہوتا تو بابا صاحب کو ایسا معلوم ہوتا کہ سورج کہ جلال سے ہر چیز سہمی ہوئی ہے۔

ان کے دل میں مختلف خیالوں کے طوفان اُٹھتے۔ کبھی وہ دن اور رات، خلوت و جلوت پر غور کرتے اور کبھی سوچتے کہ یہ تمام جدوجہد کیا چیز ہے اور کیوں ہے۔ میں کون ہوں اور اس دنیا میں کیوں آیا۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ دل میں ہُوک سی کیا اُٹھتی ہے میں کسی چیز کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ چیز مجھے کہاں سے ملے گی۔ ان کے اندر فطرت سے ہم آہنگی اور یگانگت کا احساس بھی پیدا ہوتا تھا۔

زندگی کی تڑپ اور نمود کی جوش بھی ساحل ڈھونڈتا تھا اور روح کی وہ کیفیتیں جو شعور میں بھی نہیں آسکتیں عجیب عجیب عالم دکھاتی رہتی ہیں۔

جب کوئی شخص لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی سوئی ہوئی عجیب عجیب طاقتیں جاگ جاتی ہیں۔ کل تک جو پھول صرف ایک خوشبودار پھول تھا حسین بھی معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور وہ نغمہ جو صرف دل کو بھاتا تھا اب دل کو کھینچنے بھی لگتا ہے۔ بچپن کے کھیل کود کا شوق اور دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کا ذوق پھیکا پڑ جاتا ہے اور طبیعت میں کچھ بیقراری سی رہنے لگتی ہے۔ مگر کس چیز کے لئے۔ یہ اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور قلب میں گرمی آجاتی ہے اور اس کی حرکات و سکنات ایک رُخ کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ اور بالآخر وہ ایک ساتھی حاصل کرلیتا ہے جس سے نسبی سلسلہ چلتا ہے۔

مگر ان خاص ہستیوں کو جن کے ذریعہ مشیت کچھ اور کام لینا چاہتی ہے اس دنیوی زندگی کے بھنور میں نہیں ڈالا جاتا کیونکہ اس طرح نہ تو ان کو سکون نصیب ہوگا اور نہ ہی وہ اس اعلیٰ مقصد سے ہم کنار ہو سکیں گے جس کے لئے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔ قدرت جن کو حسنِ مجرد سے بالمشافہ معانقہ کرانا چاہتی ہے۔ ان کو باطنی اور شعوری طہارت کے ذریعہ قدسی جامہ پہنانے کے لئے تیار کرتی ہے اور ان کی مادی اور جسمانی طاقتیں لطیف تر بن کر آنکھوں کی روشنی، ذہن کی رسائی، علم کا ظرف اور قلب کی وسعت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یہی کچھ بابا صاحب کے بچپن سے جوانی تک ہوتا رہا۔ بابا صاحب کی عمر ابھی اٹھارہ انیس سال سے آگے نہیں بڑھی تھی کہ آپ کے والد صاحب نے سوچا کہ ان کو کسی نہ کسی کام میں لگانا چاہیے۔ جو ہونا ہے سو ہوتا رہے گا۔ دنیا کے کاموں میں ہاتھ پائوں مشغول رہیں تو ہرج نہیں۔ اس لئے آپ کو جان حسین کمپنی وجے نگرم برانچ میں تجارت کے ڈھنگ سیکھنے کی غرض سے ملازم کرادیا گیا۔ ایک مہینہ تک اس دفتر میں کام کرنے کے بعد بابا صاحب کا تبادلہ پرلاکمڑی کا ہو گیا۔

اس وقت پرلاکمڑی میں ہیضے کا اتنا زور تھا کہ وہاں جانے کے لئے کوئی راضی نہ تھا۔ کاروبار سرد پڑ گیا تھا۔ ہر طرف نفسی نفسی کا عالم تھا۔ بابا صاحب دوکان کے دروازے پر رہتے تھے اور دیکھتے رہتے تھے کہ صبح سے شام تک سو ڈیڑھ سو نعش سامنے سے گزر جاتی ہیں۔ مگر اب بڑے ہو کر آپ کو ڈر تو کُجا یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ میں مر جائوں گا۔ اور یہ خیال آتا بھی تو کیسے آتا جبکہ آپ کی زندگی کی آگ کوہ آتش فشاں کی طرح سینہ میں دبی ہوئی تھی۔

اس وبا کے زمانے میں آپ کو صرف اپنی ذمہ داری کا احساس تھا۔ کیونکہ دکان میں نمک کے بہت بورے رکھے ہوئے تھے، جن کو منافع پر نکلنا تھا۔ مگر برسات ہونے کی وجہ سے تقریباً سارا نمک پگھل کر بہہ گیا۔ اور کمپنی کو بہت نقصان ہوا۔ کمپنی نے آپ کو

ذمہ دار ٹھہرایا۔ آپ نے اس کا تو کچھ جواب نہ دیا مگر کمپنی کو مشورہ دیا کہ وہ اس موسم کی پیداوار خرید لے اور شہروں میں فروخت کرائے۔ چنانچہ اس مشورہ پر عمل کرنے سے کمپنی کا نہ صرف سارا نقصان پورا ہو گیا بلکہ کافی بچ بھی گیا۔ کمپنی نے خوش ہو کر آپ کو ترقی دی، اور سو روپیہ ماہوار پر آپ کا تبادلہ کر دیا۔

مگر آپ کے والد محترم کو یہ جدائی گوارا نہ تھی۔ اس کے علاوہ ان کا آخری وقت آ پہنچا تھا۔ انہوں نے ایک دن آپ کو اپنے پاس بٹھا کر کہا کہ ''اب دنیا کے دھندوں کو چھوڑ دو۔ تمہارا خاندان فقیروں کا خاندان ہے۔ میرے نصیب میں تو نہیں دھا مگر تم ناگپور بابا تاج الدین اولیا کے حضور میں حاضر ہونا۔ یہ پانچ پیسے جو میں نے نیاز کے لئے رکھے ہیں ناگپور میں پانچ فقیروں کو تقسیم کر دینا۔ میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔ زندگی میں تم استقلال اور صبر کو ہاتھ سے نہ دینا۔ توکل کی زندگی بسر کرنا۔ تمہارا دل پاک ہے۔ ماسوا کو اس کے اندر نہ آنے دینا۔'' بھولے بھالے بابا صاحب ان باتوں کو کچھ نہ سمجھ سکے۔ مگر خاموش رہے اور اسی رات آپ کے والد محترم جو منبعِ محبت و شفقت تھے آپ کو اکیلا چھوڑ کر آغوشِ رحمت میں جا سوئے۔

اس کے بعد بابا صاحب پر جو کچھ گذری اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ غم اور تنہائی کے علاوہ خلا کا عالم جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ تو انسان پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اسے آنکھوں کے سامنے کی چیزوں کا احساس تو ضرور ہوتا ہے مگر ایسے ہی جیسے خواب میں دیکھی ہوئی چیزوں کا۔ بابا صاحب جب سے اس دنیا میں آئے۔ شفقتِ پدری کے علاوہ اور ہر قسم کی محبت و شفقت سے ناآشنا تھے۔ بچپن سے دکھڑا سنانے کے لئے اپنی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے اظہار کرنے کے لئے اور محبت بھری نظریں اُٹھا کر دیکھنے کے لئے بابا صاحب کا ان کے والد کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ اور وہ اب آنکھوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

مگر بابا صاحب ان کی تلاش میں دیوانہ وار نہیں پھرے بلکہ آپ کی یہ حالت ہو گئی کہ آنکھیں تو کھلی رہتی تھیں اور ان میں گہرے سمندر کی سی خاموشی طاری رہتی تھی۔ نہ آنسو بہتے تھے نہ آہیں نکلتی تھیں۔ وہ حیرت کا ایک مجسمہ بن گئے تھے۔ آپ کی مثال ان بادلوں کی سی ہو گئی جو بھادوں میں آسمان پر اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں یا اس گلاب کے پھول کی مانند جو تنہا کسی ڈالی پر تند ہوائوں کے مقابلہ میں سرنگوں ہو جائے یا اس بچھڑے کی طرح جو اپنی ماں کے گم ہو جانے پر اُڑان مار مار کر چلاتا ہے۔ اب آپ اس دنیا میں اکیلے رہ گئے تھے۔ آپ کے اس خاموش غم کا اندازہ اور احساس نہایت دشوار ہے۔ کوئل کی کوک میں وہ درد کہاں۔ آفتاب کے غروب میں وہ غم کہاں، جو بابا صاحب پر طاری تھا۔

باباصاحب کی تنہائی اس قسم کی تھی جو آفرینش عالم سے پہلے تجلیات باری کو محسوس ہوئی ہو گی۔ یہی وہ تنہائی ہے جس دور سے گزر کر انسان یکتائی کے سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ سکوت ہے جس سکوت میں مشیت کو تحریک کا موقعہ ملتا ہے اور یہی وہ خلا ہے جس میں حق کو سماتے ہوئے کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا۔

اب باباصاحب کے لئے دنیا میں کچھ نہیں رہا تھا۔ اس لئے آپ کو یہاں سے قدم اٹھانا ہی تھا۔ آپ محسوس کرنے لگے کہ جس کی مجھے تلاش ہے وہ نہ تو مسجدوں، مندروں، عید، بقر عید اور تیرتھوں میں ہے اور نہ کتابوں اور وعظوں میں۔ پھر میں جائوں تو کہاں جائوں۔ یار دوست اور ساتھی کون کس کا ساتھ دیتا ہے۔ بوالعجبی تو یہ ہے کہ میرے دوست اور اعزا مجھے حق کی طرف سے الٹا پیچھے کھینچتے ہیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں کچھ کرو۔ سرسبز ہو۔ اسلام یہی سکھاتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ اسی قسم کے خیالات میں آپ کمبلی گھاٹ کے بڑ کے نیچے تنہا بیٹھے محو رہا کرتے تھے۔

انہیں دنوں میں ناگپور سے حضرت بابا تاج الدین اولیاؒ کی چشم مست کے ایک متوالے جن کا نام حضرت بابا تھاوجے نگرم تشریف لائے۔ چونکہ وہ ناگپور سے آئے تھے اور وہاں کے متعلق باباصاحب کے والد محترم نے وصیت کی تھی اس لئے باباصاحب آداب بجالانے کے لئے ان کی خدمت میں تشریف لے گئے تو حضرت بابا آپ کی طرف دیکھتے ہی پہچان گئے کہ یہ ایک شہسوار ہے جسے میدانِ جنگ کے لئے تیار کیا جارہا ہے اور آپ کو بہت دعائیں دیں اور فرمایا کہ تم افضلین میں سے ہو اور تمہارے دل کی مرادیں پوری ہوں گی۔ پھر بھی ان باتوں سے باباصاحب کے بے قرار دل کو سکون نہ ہوا۔ اور آپ نے اسی روز ناگپور جانے کا فیصلہ کر لیا اور فرمایا کہ میں بغیر ان کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ میرے پیر ہیں۔ وہی میرے قبلہ و کعبہ ہیں۔ میرے دین اور ایمان کی روشنی ہیں۔ اور راہ نما کے بغیر منزل کا نشان نہیں ملتا۔ اپنے اس ارادہ اور خیال سے باباصاحب کو تقویب اور تسکین ہوئی۔

جس نے مجھے طلب کیا اس نے میرا خیال کیا　　جس نے میرا خیال کیا اس نے میرا ذکر کیا

جس نے میرا ذکر کیا اور نے مجھ سے محبت کی　　جس نے مجھ سے محبت کی اس نے مجھ سے عشق کیا

جس نے مجھ سے عشق کیا اس کو میں نے قتل کیا　　جس کو میں نے قتل کیا اس کا خون بہا میں خود ہوا

(سُلطان باہوؒ)

نہ فکر ہے نہ نظر لا الٰہ الا اللّٰہ
ہے ذکرِ قلب و جگر لا الٰہ الا اللّٰہ

فنا میں راز بقائے دوام ہے ہمدم
یہی ہے اصل خبر لا الٰہ الا اللّٰہ

ہے کائنات کے پردے میں جلوہ گر جاناں
نظارہ خود ہے نظر لا الٰہ الا اللّٰہ

بساطِ عقل ہلی کیا جو سمجھ سکے اس کو
حضر میں ہے یہ سفر لا الٰہ الا اللّٰہ

اگرچہ کہہ بھی گیا منہ سے لا الٰہ زاہد
رہا بشر کا بشر لا الٰہ الا اللّٰہ

شریعت اور طریقت میں فرق اتنا ہے
کہ یہ خبر وہ نظر لا الٰہ الا اللّٰہ

بھٹک رہے ہیں بہت کارواں اسی راہ میں
مثالِ حلقہ در لا الٰہ الا اللّٰہ

نمودِ عشق فنائے وجود میں مضمر
یہ لا الٰہ کا ثمر لا الٰہ الا اللّٰہ

کھنچا ہوا چلا آتا ہے بحر الا اللّٰہ
یہ فیض دیدہ تر لا الٰہ الا اللّٰہ

جو موجِ خونِ تمنا میں ڈوب کر ابھرے
اسی کا دل ہے گہر الا الٰہ الا اللّٰہ

پلک جھپکنے میں طے ہو رہی ہے منزلِ عشق
گئے ادھر سے اُدھر لا الٰہ الا اللّٰہ

(رحمن بابا)

# شاہ تاج الدین اولیاء

دُرۃ التاج محمدؐ تاجِ دین تاج الورا

سید حسنی حسینی شاہ تاج الاولیاء

تیغِ بُرّانِ ولایت دستِ بازوئے علی

تاجدارِ کُن فکانی شاہ تاج الاولیاء

نسبتِ زہرہؓ سے تم پیغمبرِ زہرہؓ ہوئے

یعنی سر تاج ولایت شاہ تاج الاولیاء

جس کو چاہا، جب بھی چاہا، جیسا چاہا کر دیا

اے ولی کے دین و ایمان شاہ تاج الاولیاء

(ولی الدین)